Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:2 (1968) © rasailojaraid.com

صدرِ اسلام میں سنّت کا تصوّر

محمّد یوسف گورایہ ـــ ریسرچ فیلو ادارہ تحقیقات اسلامی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کی تعلیمات کے افہام وتفہیم اور ترویج وتنفیذ کے لئے جن مثالی اصولوں، بلند نظریات اور ہمہ گیر و عالم گیر تصورات کو پیشِ نظر رکھتے تھے، اُن کا نام سُنت ہے۔ قرآن نے جس اتباعِ سنتِ رسولؐ کی بار بار تاکید کی ہے، اس سے انہیں اُصولوں، نظریات اور تصورات کی اتباع مراد ہے۔ اور آپؐ انہیں اُصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتے اور دوسروں کو ان کی طرف عمل کی دعوت دیتے تھے۔ آنحضرت صلعم کوشش فرماتے کہ آپؐ کے ماننے والے آپؐ کی اس سُنت کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کریں اور اس کے مطابق قرآن کی تعلیمات پر عمل کریں، چنانچہ ان میں سے جو حضرات اس سُنت کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کر لیتے، قرآن حکیم کی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کے قابل ہو جاتے۔ اور اُن میں سے جس کسی کا فہمِ سُنت جتنا زیادہ ہوتا، اتنا ہی اس کا عمل خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق ہوتا۔

اسلام میں اتباعِ رسولؐ اتنی اہم ہے کہ قرآن حکیم میں اطاعتِ رسول کو اللہ کی اطاعت کے برابر قرار دیا گیا ہے "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ قرآن میں اتباعِ رسولؐ پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ ایک تو یہ کہ آنحضرت صلعم کی اتباعِ سُنت کے بغیر نہ تو قرآن کی تعلیمات کا پوری طرح ادراک ہو سکتا ہے، اور نہ ان پر کسی صالح معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عرب اپنے آباؤ اجداد کی رسوم و عادات کی تقلید کے سختی سے پابند تھے۔ اور وہ ان کی جگہ کسی بھی فرد کی اطاعت قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ عربوں کی یہ روایت آنحضرت صلعم کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی راہ میں حائل تھی۔ چناں چہ قرآنی تعلیمات کے صحیح فہم و ادراک اور عرب آباء و اجداد کی جگہ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کے لئے ناگزیر تھا کہ آنحضرت صلعم کی اتباع پر اتنا زور دیا جاتا۔ اتباعِ سُنتِ رسولؐ پر اس اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص بھی رسولِ اکرمؐ پر ایمان لاتا، لازمی طور پر آں حضرت صلعم کے نقطۂ نظر کو اپناتا۔ اور اس کے مطابق اپنی روزمرّہ زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے معاملات کو چلاتا۔ اس کے لئے کافی نہ تھا کہ وہ محض اللہ کی طرف سے منزّل تعلیمات پر ایمان لاتا۔ بلکہ اس کے لئے ضروری تھا کہ ان تعلیمات کے ذریعے آنحضرت صلعم جس انقلاب کے داعی تھے، اس کے مثالی اصول اور اصل روح سے واقفیت حاصل کرتا اور ان کو اپنا کر قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا۔ ایمان لانے کے بعد آں حضرت صلعم کی صحبت میں رہ کر جو تعلیم و تربیت حاصل کی جاتی تھی، اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ رسول اللہ، ایمان لانے والوں کی ان اصولوں کی طرف رہنمائی فرمائیں تاکہ ان کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کے لائحہ عمل کو ترتیب دیں۔ اسی کا نام صحابیت ہے، اور اسی لئے جو لوگ اس شرف سے باریاب ہوتے، صحابہ کہلاتے۔

صحابہ کرام میں سے جن بزرگوں کو سنتِ رسولؐ کے اعلیٰ اصولوں سے زیادہ سے زیادہ واقفیت کا موقع ملا، ان کی عظمت کا اعتراف تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔ قرآن حکیم نے بھی بتصریح اس کا اعتراف کیا ہے: ”والسٰبقون الاوّلون من المہٰجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ“ (التوبہ: ۱۰۰) مہاجرین و انصار میں سے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں سے اور ان لوگوں سے جو ان کے بعد خوش اسلوبی سے ان کے طریقے پر لگے رہے، اللہ اُن سے راضی ہُوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ آنحضرت صلعم کی دعوت کی کامیابی کا راز اس میں تھا کہ آپؐ نے ایک ایسی جماعت تیار کی جو قرآنی تعلیمات کو سنتِ رسولؐ کے مطابق عملاً نافذ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔ قرآنی تعلیمات کو سنتِ رسول کے مطابق نافذ کرنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک قلیل عرصے میں عرب اس قابل ہو گئے کہ وہ قرآنی انقلاب کو آنحضرتؐ کی زندگی میں برپا کر سکے، اور آپؐ کی وفات کے بعد غیر معمولی رفتار سے ایک سو سال کے اندر اندر پوری متمدن دنیا کے واحد مالک بن گئے۔

اسلام میں سُنت کی اہمیت کے پیشِ نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی کے اس نہایت اہم موضوع پر کثرت سے لکھا جائے، اور قرآن حکیم اور دیگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی صحیح تعبیر و تعین کی جائے۔ جیسا کہ اس مقالے کے شروع میں بیان ہُوا، سُنت سے مراد وہ مثالی اصول و نظریات ہیں جنھیں آنحضرت صلعم قرآنی تعلیمات کو عملاً نافذ کرتے وقت اپنے پیشِ نظر رکھتے تھے۔ ان اصولوں کی روشنی میں جو فعل معرضِ وجود میں آتا، وہ ان خاص تاریخی حالات میں سنت کے ہمہ گیر اور ہمہ پہلو تصور کا ایک پہلو ہوتا، اور وہ فعل جتنا ان اصولوں کے قریب ہوتا، اتنا ہی وہ سنت کے مطابق ہوتا۔

سُنت کا یہ تصور کہ وہ صرف راستے کے بجائے راستے پر چلنے کے لئے اصول و قواعد کا نام ہے، لغت میں بھی عام ہے۔ چنانچہ ابن منظور الافریقی المصری نے ”لسان العرب“ میں سنت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ”السنۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فی الاصل سنة الطریق، وھو طریق سنه اوائل الناس فصار مسلکاً لمن بعدھم"۔ اصل میں سُنت سے مراد ہے راستے کی سُنت اور وہ ہے ایک ایسا راستہ، جسے پہلوں نے ہموار کیا ہو، اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے مسلک بن گیا ہو"۔ یہاں سنت سے مراد راستے کی جان اور روح ہے، جس پر راستے کا دارومدار ہوتا ہے، اور جس کے بغیر راستہ قائم نہیں رہ سکتا، اب راستے کے قیام سے مراد صرف اس کی ظاہری شکل و صورت نہیں بلکہ وہ معنوی حیثیت بھی ہے جس کے پیشِ نظر مؤسسِ اوّل اس راستے کو اختیار کرتا ہے۔ جب تک یہ چیز اس راستے میں پائی جائے گی، وہ راستہ قائم رہے گا۔ اسی طرح "سَنَنتُ لکم سنة فاتبعوھا" سے بھی یہی مراد ہے کہ میں نے تمہارے چلنے کے لئے اصول مقرر کر دیئے ہیں، تم ان کی اتباع کرو۔ اور جہاں تک تم ان اصولوں کی پیروی کرتے ہوگے، میری سُنت کی پیروی ہوتی رہے گی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں نے زمین پر چل کر باقاعدہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر کیا ہے، چنانچہ تم میرے پاؤں پر پاؤں رکھتے جاؤ اور جہاں تک میرے نقشِ قدم تمہیں نظر آتے جائیں، تم چلتے جاؤ۔ غرض سُنت کے معنی متبعین کی رہنمائی کے لئے اصول و قواعد مقرر کرنا ہے، تاکہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کا سفر طے کرتے چلے جائیں۔ چنانچہ سنت راستے پر چلنے کے لئے قائم کردہ مثالی اصول و قواعد کا نام ہے۔ نہ کہ راستہ بذاتِ خود۔ جن کا عملی نمونہ خود یہ راستہ بھی تھا۔

آنحضرت صلعم کی دعوت کے نتیجے میں عرب معاملاتِ زندگی کو جماعت (آباء) کے بجائے فرد (رسولؐ) کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے۔ آنحضرت صلعم کا دیا ہُوا یہ نقطۂ نظر ایک معیار تھا، جس پر وہ اپنی رسوم و عادات کو پرکھتے اور جو چیز اس معیار پر پوری اُترتی، اُسے اختیار کرتے اور جو چیز اس پر پوری نہ اُترتی، اُسے ترک کر دیتے۔ اخذ و ترک کے اس عمل میں وہ چیز جو عمل کی صورت میں معرضِ وجود میں آتی، سنتِ رسول نہ تھی، بلکہ سنتِ رسول وہ چیز تھی جو اخذ و ترک کے وقت معیار کے طور پر ان کے ذہن میں ہوتی۔ مغرب کے مشہور و معروف مستشرق گولڈزیہر نے کہا ہے: "بعثتِ رسولؐ کے فوراً بعد آپؐ کا طرزِ عمل مسلمانوں کی نوزائیدہ جماعت کے لئے سُنت کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اور قبل از اسلام عربوں کا مثالی اسوہ اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا"۔ آنحضرت صلعم کی یہ سنت جو نوزائیدہ مسلم اُمت کے لئے نمونے کا کام دیتی تھی۔ اور صحابہ کرام اُسے اپنے روزمرہ کے معاملات میں پیشِ نظر رکھتے تھے، درحقیقت آنحضرت صلعم کا نقطۂ نظر تھا، جو ایک روشنی کے مینار کی طرح زندگی کے ہر شعبے میں ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ وہ ایک معیار تھا جس پر وہ اپنے ہر قول و فعل کو جانچتے تھے۔ کیونکہ یہ عملاً محال تھا کہ آنحضرت صلعم ہر کام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلے خود کرتے، اور پھر آپؐ صحابہ کو وہ کام اس طرح کرنے کا حکم فرماتے۔ ایسا کرنا ایک تو ممکن نہ تھا اور دوسرے تاریخ شاھد ہے کہ آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ سُنت سے مراد آنحضرت صلعم کا نقطۂ نظر تھا جس کے پیشِ نظر آپؐ قرآن حکیم کی تعلیمات کی ترویج و تنفیذ کرتے تھے۔ اب ہم صحابہ کرام کے طرزِ عمل پر غور کرتے ہیں کہ اس گروہ قدسی نے سنتِ رسول سے کیا مراد لی تھی اور اس پر کس طرح عمل کیا تھا۔

دو صحابی ایک سفر میں تھے۔ انہیں ایک نماز کا وقت ایسی جگہ آگیا، جہاں پانی موجود نہ تھا، دونوں نے تیمم کر کے نماز ادا کر لی۔ کچھ دُور چلنے کے بعد جب پانی ملا تو ایک نے پانی سے وضو کر کے نماز دوہرا لی، لیکن دوسرے نے اس کا دوہرانا ضروری نہیں سمجھا۔ واپسی پر دونوں نے اپنا واقعہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا جس نے وضو کر کے نماز دہرائی، اس کے لئے دو اجر ہیں۔ اور دوسرے کو مخاطب کر کے فرمایا" قد اصبت السنة" تو نے (میری) سنت کو پا لیا۔[1] اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس بارے میں بظاہر آپ نے کوئی ھدایت نہیں دی تھی۔ صحابہ کو یہ واقعہ اچانک پیش آگیا، دونوں نے آنحضرتؐ کے نقطۂ نظر سے اس پر غور کیا اور دونوں مختلف نتیجوں پر پہنچے، چونکہ دونوں نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ اور علم سنتِ رسولؐ کے مطابق کوشش کی، اس لیے آنحضرت صلعم نے دونوں کے استنباط کو قبول کیا۔ لیکن ساتھ ہی ایک بنیادی بات کی وضاحت کر دی کہ میرے نقطۂ نظر کو پانے میں وہ شخص کامیاب ہوا جس نے تیمم سے نماز کو کافی سمجھا اور وضو کر کے تکلف نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں اگر میں (آنحضرت صلعم) اس موقع پر ہوتا تو ایسا ہی کرتا، جیسے کہ وضو نہ کرنے والے نے کیا۔ رسول اللہؐ کے اس ایک جملے نے سنت کے تصوّر کو واضح کر دیا کہ سنت آنحضرت صلعم کے نقطۂ نظر کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے، نہ کہ عمل بذاتِ خود۔

زکوٰۃ کے مصارف میں" مؤلفة قلوب" ایک ایسی مد ہے جس کو قرآن حکیم نے خود بیان کیا ہے۔ آنحضرت صلعم نے اسی پر عمل فرماتے ہوئے اس کے مستحقین کو زکوٰۃ کا مقررہ حصہ ادا کیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی خلافت میں اس پر عمل کیا، لیکن حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلعم کے عمل اور خلیفہ اوّل کی پالیسی کو بالکل بدل دیا، اور جن لوگوں کو اس خاص مد سے زکوٰۃ کا حصہ دیا جاتا تھا، اُسے ختم کر دیا۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی سنت سے مراد آپؐ کے افعال و اعمال کی روح تھی۔ آپؐ کے مثالی اصول و مقاصد تھے۔ نہ کہ حالات و واقعات کے بدل جانے کے باوجود محض اعمال کا دہرانا۔ ظاہر ہے حضرت عمرؓ سے بڑھ کر کون زیادہ متبعِ سنت ہو سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ ان حالات میں

© rasailojaraid.com

---

[1] امام سحنون بن سعید۔ المدونة الکبریٰ ج ۱ ص ۴۳۔

© rasailojaraid.com

اگر آنحضرت صلعم خود موجود ہوتے تو زکوٰۃ کی اس مد کو ان لوگوں کے لئے ضرور بند کر دیتے، جنہیں آپؐ نے اپنے زمانے کے حالات کے پیشِ نظر دینا ضروری سمجھا تھا۔ اب حضرت عمرؓ نے جو فیصلہ کیا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ سُنتِ رسول کے خلاف تھا۔ بلکہ پُوری اُمت کا اتفاق ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسولؐ کی سُنت کے مطابق عمل کیا۔ اور جو کچھ کیا، حالات و وقت کا عین تقاضا تھا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کے نزدیک آنحضرت صلعم کے نقطۂ نظر کے مطابق ایسا کرنا ہی سنت تھا۔ باوجودیکہ سنت کا ایک پہلو خود جنابِ رسالت مآب کے فی الواقع عمل کی صورت میں اس خاص مسئلے پر موجود تھا۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے سے ثابت ہوا کہ سنت آنحضرت صلعم کے اعمال و افعال و اقوال کی روح کا نام ہے۔ سنت ان مقاصد کا نام ہے جن کے تحت یہ اعمال معرضِ وجود میں آئے تھے۔

عہدِ رسالت میں حج کے شعار میں سے تھا کہ کعبے کے گرد طواف کرتے وقت ایک خاص مقام سے دوسرے مقام تک اکڑ کر دوڑا جائے، جسے الرمل کہا جاتا تھا۔ آنحضرت صلعم نے ہزاروں صحابہ کے ساتھ اس پر عمل کیا، لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اس رسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔[1] "مالنا وللرمل انما کنا رأینا بہ المشرکین وقد اھلکھم اللہ" ہمارا اس رَمَل کی رسم سے کیا تعلق۔ اسے تو مشرکین کو دکھانا مقصود تھا اور اب انہیں اللہ نے ہلاک کر دیا ہے۔ اب جن حالات کے تحت رسولِ اکرمؐ نے اس رسم پر عمل کیا تھا، حضرت عمرؓ کے زمانے تک وہ کافی حد تک بدل چکے تھے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے سنتِ رسول کے پیشِ نظر اسے ختم کر دیا۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہاں سُنت سے مراد آنحضرت صلعم کے ایک خاص عمل کو ختم کر دینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل بذاتِ خود سُنت کا معیار نہیں ہو سکتا بلکہ سُنت اس معیار کا نام ہے جو حالات کے مطابق عمل کے جاری رہنے یا ختم کر دینے کی ضمانت دے۔ اور وہ آنحضرت صلعم کا نقطۂ نظر اور آپؐ کا زاویۂ نگاہ ہے۔ نہ کہ اس نقطۂ نظر کے تحت عمل میں آنے والے اعمال۔ جو ایک وقت اور ایک خاص ماحول میں وجود میں آئے۔

تقسیم مالِ غنیمت کے بارے میں قرآن کا حکم واضح الفاظ میں موجود ہے:۔ واعلموا انما غنمتم من شئی فان للہ خمسہ وللرسول۔ الآیۃ (انفال: ۴۲) آنحضرت صلعم نے قرآن کی اس تعلیم پر اپنے حالات کے مطابق عمل فرمایا۔ آپؐ خمس کے بعد تمام غنائم مجاھدین میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق کی فتح پر وہاں کی زمینیں مجاھدین میں تقسیم کرنے کے بجائے "سٹیٹ

[1] صحیح بخاری۔ جلد ۱ ص ۲۱۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پراپرٹی" قرار دے دیں، اور ان کی آمدنی کا ایک خاص حصہ مجاہدین میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگ جو رسول اللہؐ کے محض عمل کو سُنت خیال کئے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ پر سخت ناراض ہوئے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جب واضح کیا کہ سنتِ رسولؐ محض عملِ رسول کے دہرانے کا نام نہیں بلکہ سنتِ رسولؐ ان ہمہ گیر اور عالمگیر اصولوں اور مثالی نظریات کا نام ہے، جن کے تحت آپؐ عمل کیا کرتے تھے، تو وہ لوگ جنھوں نے اختلاف کیا تھا اُن کے ہم خیال ہو گئے[۱]۔ بات یہ تھی کہ آں حضرت صلعم نے خیبر وغیرہ کی زمینیں جب مجاہدین پر تقسیم کیں، تو اس وقت کے حالات کا تقاضا وہی تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں جب پورا جزیرہ عرب ایک فوجی کیمپ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور ہر عرب حضرت عمرؓ کی فوج کا سپاہی تھا تو ایسی صورت میں فوجیوں کو کیمپ سے نکال کر زمینیں آباد کرنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے پر لگا دینے سے نہ تو مفتوحہ علاقوں کی حفاظت ہی ہو سکتی تھی اور نہ اسلام کے مشن کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے یہ خیال کر کے کہ اگر رسول اکرمؐ خود بہ نفسِ نفیس اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے تو کیا کرتے، یہی فیصلہ کیا کہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم نہیں کیں۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ سنتِ رسولؐ کے عین مطابق تھا۔ اگرچہ بظاہر آنحضرت صلعم کا عمل اس کے خلاف موجود تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ سنتِ رسولؐ کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ اور اس پر خاص حالات میں جو ایک عمل معرضِ وجود میں آتا ہے، سنت کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہوتا بلکہ اس کی ایک تفسیر ہوتا ہے اور اس کے بے شمار معنوں میں سے ایک معنی ہوتا ہے اور صحابہ کرام کے یہ واقعات سنتِ رسولؐ کے تصور کو متعین کرنے میں بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں ـــــــ تابعین و تبع تابعین کے عہد میں بھی سنتِ رسولؐ سے یہی مراد لی جاتی تھی۔ چنانچہ مؤطا امام مالکؒ، مدینہ کے فقہائے تابعین و تبع تابعین کے اس تصورِ سُنت پر واضح دلیل ہے۔ صحابہ کرام کے مندرجہ بالا اتباعِ سُنتِ رسول کے مطابق تابعین و تبع تابعین کا بھی یہی مسلک رہا کہ وہ اپنے معاملات کے حل کے لئے رسول اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات اور صحابہ کرام کے فیصلہ جات سے آنحضرتؐ کے نقطۂ نظر کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ اور جب پوری سوچ بچار کے بعد یہ سمجھ لیتے کہ اگر حضور اکرمؐ اس وقت موجود ہوتے تو کیا کرتے، اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم مدینہ کے قاضی تھے۔ ان کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس کی نظیر ایک حدیث کی صورت میں رسول اللہؐ کے عمل کی شکل میں موجود تھی۔ لیکن محمد بن ابی بکر نے اس حدیث کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس کے بعد جب گھر گئے تو اُن کے بھائی عبداللہ بن ابی بکر نے اُن سے پوچھا، کیا آپ نے آج یہ فیصلہ دیا ہے۔ محمد نے جواب دیا، "ہاں میرے بھائی" (میں نے

[۱] ابو یوسفؒ - کتاب الخراج۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسا ہی کیا ہے) عبداللہ نے کہا: "لیکن میرے بھائی (اس سلسلے میں جو) حدیث موجود ہے اس کا کیا بنا؟ حدیث تو اتنی ضروری ہے، کہ اس پر فیصلوں کی بنیاد رکھی جانی چاہیئے۔" محمد نے جواب دیا: "کاش! آپ مسلمانوں کے عمل پر غور کرتے۔" (الطبری، تاریخ، جلد سوم صہ ۵-۲۵) - امام مالکؒ نے محمد بن ابی بکر کے اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ فقہائے مدینہ ماضی کے واقعات وحالات کا جائزہ لینے کے بعد اجتماعی طور پر جس فیصلہ پر پہنچتے، وہ فیصلہ رسول اللہ صلعم کی سُنت کے زیادہ قریب ہوتا - اور وہ حدیث کی نسبت اُسے زیادہ قابلِ اعتماد خیال کرتے ———— شیخ ابو زہرہ مدینہ کے فقہائے سبعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۴]: "یہ وہ لوگ تھے، جنہوں نے مدنی فقہ کی بنیاد ڈالی - وہ محدثین نہ تھے جن کا کام حدیثیں بیان کرنا ہوتا ہے - بلکہ وہ فقہاء تھے جو فقہی طرزِ فکر رکھتے تھے اور انہوں نے حدیثوں پر شاذ و نادر ہی انحصار کیا تھا۔" امام مالکؒ سے پہلے بعض فقہائے مدینہ نے موطّات تیار کیں، چونکہ تاریخ نے فقہ اسلامی کے ان قیمتی مجموعوں کو محفوظ نہیں رکھا، اس لئے ہماری معلومات ان کے بارے میں نہایت محدود ہیں لیکن جو کچھ ان کے بارے میں ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے کہ ان فقہاء نے بقول زرقانی[۵] اپنی اپنی موطّا میں حدیث کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا تھا - بلکہ عہدِ رسالتؐ و عہدِ صحابہؓ کے حالات پر غور کرنے کے بعد جو کچھ اُنھوں نے سنت کے بارے میں سمجھا، اپنے الفاظ میں بیان کر دیا - صدرِ اسلام کے ان فقہاء کی یہ کاوشیں در اصل ان کی اسلام فہمی کا نچوڑ تھیں - گزشتہ واقعات پر سوچ بچار کر کے اُنہوں نے جو اُصول و قواعد مستنبط کئے تھے، ان مجموعوں میں ان کو قلم بند کیا تھا - ان فقہاء کے یہ قواعدِ کلیہ ان کے زمانے کے حالات کے لئے ایک معیار تھے - لوگ اس ترازو پر اپنے معاملاتِ زندگی کو تولتے اور ان کے مطابق عمل کرتے - اس اعتبار سے ان فقہاء کے یہ قواعد کلیہ سنتِ رسولؐ کے قائم مقام تھے - اور اس عہد کے لئے وہی سنت رسولؐ تھے - اگرچہ ان فقہاء نے آنحضرتؐ اور صحابہ کرام کے واقعات کو اسناد اور روایات کی شکل میں بیان نہیں کیا تھا لیکن ان واقعات و حالات سے جو کام لینا مقصود تھا اُس کو بیان کر دیا - لیکن یہ بات انتہائی اہم اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سنتِ رسولؐ کے فہم و حصول کے لئے عہدِ رسالت کے حالات و واقعات کا ایک ایک واقعہ اور ان کا قلیل سے قلیل حصہ سنتِ رسولؐ کو اپنے اندر لئے ہوئے تھا - اور ان عہدوں کے حالات کا تفصیلی علم اور گہرا مطالعہ سنتِ رسولؐ کے فہم کے لئے ازحد ضروری تھا - اور ان کو مانے اور جانے بغیر سنتِ رسول حاصل نہیں ہو سکتی تھی - لیکن یہ بات اس سے بالکل مختلف ہے کہ انھوں نے ان واقعات کا بیان اور ان پر بعینہٖ عمل ضروری نہیں سمجھا تھا -

صدرِ اسلام کے شامی فقہاء کا تصورِ سنت بھی یہی تھا - امام اوزاعی جو اُن کے نظریات کے نمائندہ تھے،

© rasailojaraid.com

[۴] مالک، صہ ۱۵۸ [۵] شرح الموطا۔ ج ۱ صہ ۷۔

© rasailojaraid.com

ان کے نزدیک مسلمانوں کا وہ اجماعی عمل جو سُنتِ رسولؐ کے زیادہ قریب ہوتا، احادیث کی نسبت زیادہ قابلِ اتباع تھا۔ ان کا یہ نظریہ اس بات پر مبنی تھا کہ مسلمان مجموعی طور پر سنتِ رسولؐ کو زیادہ جانتے تھے۔ دارالحرب میں جنگی قیدیوں کی بیع پر امام ابوحنیفہؒ کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے امام اوزاعیؒ نے کہا، مسلمان ہمیشہ سے دارالحرب میں جنگی قیدیوں کی بیع کرتے چلے آئے ہیں۔ (الرد ص ۸۱)۔ امام اوزاعی اکثر اپنے نظریات کا جواز سنۃ المسلمین میں ڈھونڈھتے تھے جس سے ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے بجائے وہ اس چیز کی اتباع کرنا چاہتے تھے جس میں سنتِ رسولؐ کے اصول کی زیادہ نمائندگی ہوتی ہو، اور ان کے نزدیک سنۃ المسلمین سنتِ رسولؐ کی زیادہ متحمل تھی۔ اسی لئے وہ اس کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتے تھے۔

کوفے میں جس مکتبِ فکر کی بنیاد امام ابوحنیفہ نے ڈالی تھی۔ ان کے نزدیک بھی حدیث اور سنت میں بڑا فرق تھا۔ حدیث ان کے لئے سُنت کا مواد مہیا کرتی تھی جس سے وہ سنت کا استنباط کرتے تھے یا ماضی کے واقعات و حالات سے انھوں نے قواعدِ کلیہ مستنبط کر رکھے تھے، جن کی روشنی میں وہ حال کے معاملات کا جائزہ لیتے اور ان قواعد کے معیار پر انہیں پرکھتے۔ اہلِ عراق کے ہاں ان قواعد کلیہ کا نام "السنۃ المحفوظۃ المعروفۃ" تھا، جو دراصل سنتِ رسولؐ کی قائم مقام تھی۔ (الأم ۷: ۳۱۴)، یہ السنۃ المحفوظۃ المعروفۃ ان کے ہاں باقی تمام دلائل سے قوی اور سب سے زیادہ قابلِ اتباع تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ اس قرنِ خیر میں کسی ایسی سنت کا اتباع جو سنتِ رسولؐ نہ ہو، ممکن نہ تھا۔ ایک خاص مسئلے پر ابویوسف امام ابوحنیفہ کا نقطۂ نظر بیان کرتے کے بعد کہتے ہیں، کہ "یہی سنت ہے۔ اور اسلام کا یہی مقصد و منشا رہا ہے۔ اگرچہ رسول اللہؐ نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا" (الرد ص ۱۳۴)۔ امام ابویوسفؒ کے اس بیان سے امام ابوحنیفہؒ کے مکتبِ فکر کے تصورِ سنت کا پتہ چلتا ہے۔ امام ابویوسفؒ کے نزدیک سنتِ رسولؐ سے مراد آنحضرت صلعم کے اصول و قواعد ہیں۔ اور یہی اصول و قواعد قابلِ اتباع ہیں۔ اب اگر رسول اللہؐ نے کوئی عمل کیا، یا آپؐ نے اس بارے میں کوئی زبانی ہدایت دی تو ان افعال و اقوال کو ان اصول و قواعد کی روشنی میں سمجھا جائے گا کیونکہ آنحضرت صلعم کا ایک فعل اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب سنت کے باقی پہلوؤں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

ایک اور موقع پر امام ابویوسفؒ نے حدیث و سنت کے فرق پر بحث کرتے ہوئے مخالف کے جواب میں لکھا ہے کہ اس حدیث کو ہم بھی جانتے ہیں، اور یہ ہم تک بھی پہنچی ہے۔ لیکن رسول اللہ کی حدیث جامع المعانی ہوتی ہے۔ اس کی مختلف جہات ہوتی ہیں اور اس کی تفسیر ہوتی ہے اور جس کی مدد، اُسے سمجھنے کے لئے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ کرے، اس کے علاوہ کوئی نہ اُسے سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کو دیکھ سکتا ہے۔" قال ابو یوسف: قد بلغنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما قال الاوزاعی، ولحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معان ووجوہ وتفسیر لایفہمہ ولا یبصرہ الا من اعانہ اللہ تعالیٰ علیہ (الرد ص۱۴) ابو یوسفؒ کا یہ بیان در اصل سنت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے سب سے بنیادی بیان ہے۔ اس میں ابو یوسفؒ نے نہایت واضح الفاظ میں حدیث اور سنت کے فرق کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق احادیث، رسول اللہؐ کی زندگی کے حالات کا بیان ہیں، اور ان حالات کو جانے بغیر سنت کا حصول ناممکن ہے۔ لیکن احادیث میں سے سنت کو نکالنا گہرے غور و خوض اور بڑی سمجھ بوجھ کا کام ہے۔ دوسرے احادیث، سنتِ رسولؐ کے مترادف نہیں، اتباعِ سنتِ رسولؐ سے مراد احادیث میں درج واقعات کو دہرانا اور ان واقعات کو بعینہٖ وقوع پذیر ہوتے دیکھنا سنت نہیں۔ بلکہ ان پہ غور کرکے ان اصول و قواعد کا استنباط کرنا مقصود ہے جن کے تحت آنحضرتؐ سے وہ اعمال و اقوال وقوع پذیر ہوئے تھے، تاکہ آں حضرت صلعم کا نقطۂ نظر معلوم ہو جائے۔ اور اس کی اتباع کرتے ہوئے اپنے حال کے معاملات زندگی کا حل ڈھونڈھا جائے۔ امام ابو یوسفؒ کے ان الفاظ: "ولحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معان ووجوہ وتفسیر" سے یہی مراد ہے، وہ حدیث کی ظاہری شکل و صورت اور جن واقعات پر وہ مشتمل ہے، ان کو بعینہٖ دُہرانے کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ تاریخ کا ایک واقعہ جس کا عملاً ظہور ہو چکا ہو، بعینہٖ دوبارہ اُس کا وقوع پذیر ہونا محال ہے۔ اسی لئے امام ابو یوسف کے خیال میں رسول اللہ صلعم کے واقعات و احادیث کو بغیر سمجھے دہرانے کے بجائے ان پہ غور و خوض کیا جانا چاہیئے۔ ان کے معانی و مطالب کو سمجھنے کے لئے عقل اور سمجھ سے کام لینا چاہیئے۔ اور کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کے ذریعے آنحضرت صلعم کا مقصد و منشا معلوم ہو سکے، اس لئے کہ اتباع سنت رسول سے یہی مراد ہے۔ غرض اہل عراق کا تصورِ سنت بھی وہی ہوا جو ان کے دوسرے معاصر فقہاء شام، حجاز اور دوسرے علاقوں کا تھا۔

فقہ اسلامی میں ہم تک پہنچنے والی سب سے قدیم اور جامع کتاب مؤطا امام مالک ہے۔ اور ضروری ہے کہ ہم اس کتاب کی روشنی میں دیکھیں کہ مدینہ جسے "دار السنۃ" کہا جاتا ہے، اس کے سب سے بڑے محدّث فقیہہ امام مالک کا سنت کے بارے میں کیا تصور تھا۔ امام مالک کے ہاں حدیث اور سنت مترادف نہیں ہیں۔ بلکہ وہ احادیث کے مجموعے سے سنتِ رسول کی تلاش کرتے ہیں۔ مؤطا کے صفحات اس بات پر شاہد ہیں کہ احادیث امام مالک کے لئے بڑا قیمتی سرمایہ تھیں۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسا مواد تھا جس سے وہ سنتِ رسول تلاش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر سکتے تھے۔ بایں ہمہ احادیث ان کے لئے مقصود بالذات معلوم نہیں ہوتیں، بلکہ وہ اس اعلیٰ و ارفع مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اسی لئے وہ احادیثِ رسولؐ بیان ضرور کرتے ہیں۔ لیکن سنت و حدیث کے تصادم کے وقت وہ سنت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ سنت کا وہ پہلو جس کا اظہار پہلے کسی عمل کی صورت میں ہو چکا ہو اور وہ ان کے زمانے کے حالات کے ساتھ مطابقت نہ رکھتا ہو تو وہ اس پہلو کے بجائے سنت کے دوسرے پہلو کی تلاش کریں گے اور اس پر اپنے عمل کی بنیاد رکھیں گے۔

امام مالک نے مؤطا میں ایک حدیث بیان کی ہے کہ جو شخص کسی کو عمریٰ (عمر بھر کے لئے عطیہ) دے تو وہ اس کے لئے ہے اور اس کے بعد اس کے وارثوں کے لئے ہے۔ (مؤطا، سنہ ۱۳۱۰ھ ج ۲، ص ۲۱۹) لیکن وہ رسول اللہؐ کی اس حدیث کے خلاف، جسے انہوں نے خود بیان کیا ہے، کہتے ہیں کہ عمریٰ اس شخص کی زندگی کے ساتھ مشروط ہے، اور اس کے مرنے کے بعد اس میں وراثت نہیں چلے گی اور عمریٰ واپس اس شخص کی طرف لوٹ جائے گا جس نے اُسے عطا کیا تھا۔ عمریٰ کے متعلق امام مالک کا یہ نظریہ بظاہر حدیثِ رسولؐ کے خلاف ہے۔ لیکن ہم گمان نہیں کر سکتے کہ امام مالکؒ اس حدیث کو سنتِ رسول سمجھ کر بھی اس کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ سنتِ رسولؐ کے اس پہلو کو ماننے کے لئے تیار نہیں جس کا ذکر مذکورہ حدیث میں ہے۔ اور وہ سنت کے دوسرے مفہوم اور معانی کے پیشِ نظر اس پہلو کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، جو اُن کے نزدیک اپنے حالات کے مطابق سنتِ رسولؐ کی زیادہ نمائندگی کرتا ہے۔

امام مالکؒ نے ایک اور حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ کسی بیع میں فریقین کو اس وقت تک حق اختیار ہے جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں (ایضاً ج ۲ ص ۱۳۶)۔ اس حدیث کے باوجود امام مالکؒ کہتے ہیں، ہمارے خیال میں اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، اور نہ ہمارے ہاں اس پر عمل ہے۔ اب یہاں بھی امام صاحبؒ نے سنت کے اس پہلو کا اظہار ضرور کر دیا جس پر ان سے قبل عمل ہو چکا تھا لیکن اپنے حالات کے پیشِ نظر وہ سنت کے دوسرے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں۔

مؤطا ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ امام مالکؒ کے زمانے تک اور خود ان کے اپنے نظریئے کے مطابق حدیث فی نفسہٖ ایسی چیز نہ تھی، جسے بغیر سوچے سمجھے بعینہٖ نافذ کر دیا جائے، بلکہ حدیث آنحضرت صلعم کی سنت کے وسیع تر معنوں تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھی۔ امام مالکؒ نے حج کے موقع پر تمتع کرنے کے سلسلے میں رسول اللہؐ کی ... حدیثیں ... اور ایک چوتھی حدیث حضرت عمرؓ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بیان کی ہے، جس میں انھوں نے تمتع کو منع کردیا تھا۔ امام صاحبؒ نے آنحضرتؐ کی احادیث کے مقابلے میں حضرت عمرؓ کے عمل کو ترجیح دی ہے (موطا ج ۲، ص ۱۶۹ تا ص ۱۷۸)۔ کتاب الام میں الربیع نے امام مالکؒ کے اس نظریئے کے متعلق صاف صاف لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے کہا: ضحاک بن قیسؒ کی روایت جس کے مطابق حضرت عمرؓ نے تمتع کو منع کردیا تھا، میرے نزدیک سعد بن ابی وقاصؓ کی اس روایت پر ترجیح رکھتی ہے، جس میں رسول اللہؐ کے عمل کا بیان ہے۔ (الام ج ۷، ص ۱۹۹) دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ روایت بذاتِ خود اتنی اہم نہیں بلکہ ہر حدیث پر غور کیا جائے گا۔ اور اس کے مختلف معانی کے پیشِ نظر اس معنی کو ترجیح دی جائے گی جو سنت کے قریب تر ہوگا۔ اس سے ایک دوسری بات کا پتہ بھی چلا کہ احادیث سنت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہیں۔ اور سنت کے کئی معانی و مطالب کا پتہ دیتی ہیں۔ مثلاً اسی حدیث میں ایک پہلو وہ ہے جس پر آنحضرتؐ نے اپنے زمانے میں عمل کیا اور ایک وہ جس پر حضرت عمرؓ نے عمل کیا۔ یہ دونوں پہلو، سنت کے دوسرے بہت سے پہلوؤں میں سے دو ہیں۔ جس طرح آنحضرت صلعم کے زمانے کے حالات کے مطابق وہ عمل سُنت تھا، جس پر آنحضرت صلعم نے عمل کیا۔ اسی طرح وہ عمل جسے حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اپنایا، وہ بھی سنت تھا۔ اور یہ دونوں پہلو سنت کے بہت سے پہلوؤں میں سے دو ہیں۔

آنحضرت صلعم کے زمانے میں اس عمل کو اپنانا جسے حضورؐ نے اختیار کیا تھا، اتباعِ سنتِ رسولؐ تھی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس عمل کو اپنانا جس پر انھوں نے عمل کیا، اتباعِ سنتِ رسولؐ تھی۔ اس لئے اتباعِ سنتِ رسولؐ، سنت کی اتباع ہے اور حدیث اتباعِ سنتِ رسولؐ کے ایک پہلو کا بیان ہے۔ اور یہ خیال کرنا کہ کسی زمانے میں سنت کے ایک پہلو پر عمل، سنت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کے بعد سنت کا کوئی دوسرا پہلو باقی نہیں، سنتِ رسولؐ کے اس نظریئے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا جسے ہم عہدِ رسالت، عہدِ خلافتِ راشدہ اور عہدِ تابعین و تبع تابعین میں دیکھتے ہیں، اور جس کی طرف امام ابو یوسفؒ نے اشارہ کیا ہے: "ولحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معان ووجوہ وتفسیر" یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بیان کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اکثر مسائل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہمارے خیال میں اس مسئلے پر عمل یوں ہونا چاہیئے اور یا یہ کہ اگرچہ احادیث بیان کی جاتی ہیں، لیکن حال کے فقہاء نے ان کے معانی یوں متعین کئے ہیں۔ اس قسم کے دوسرے بہت سے اقوال کا مطلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صرف اتنا ہے کہ امام مالکؒ اور ان کے معاصر اور ان کے پیش رو فقہاء اور ائمہ احادیث کے دوسرے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن پر ان سے پہلے عمل نہیں ہوا تھا اور زمانہ تقاضا کر رہا تھا کہ اب سنت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے تاکہ ان پر عمل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک احادیث کی نسبت فقہاء کے متعین کردہ اصول و قواعد زیادہ قابلِ عمل تھے (الامُ ج ۷، ص ۱۹۶)۔ اور امام صاحبؒ اس قسم کے قواعدِ کلیہ کو ان اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔ الامر عندنا، والامر المجتمع علیہ عندنا، السنۃ التی لا اختلاف فیھا عندنا۔ وغیرہ۔

امام مالکؒ کی کتاب موطّا اس بات پر گواہ ہے کہ امام صاحبؒ ماضی کے واقعات و احادیث سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان سے استشہاد کرتے ہیں۔ لیکن ان واقعات و حالات کو بعینہٖ دوہرانے کے قائل نہیں ہیں، خواہ وہ واقعات و احادیث کسی بڑے سے بڑے بزرگ شخص کی طرف ہی کیوں منسوب نہ ہوں۔ سجود فی القرآن کے سلسلے میں امام مالکؒ نے پانچ حدیثیں بیان کی ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کے عمل کا بیان ہے، جس کی بنیاد حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہؐ کے عمل پر رکھی تھی۔ الزرقانی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے شرح موطّا میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے اس عمل پر چاروں خلفاؓ کا بھی عمل رہا ہے۔ اور تینوں ائمہ اور دوسرے علماؒ بھی اسی پر عمل پیرا رہے ہیں، (موطّا ج ۱، ص ۲۰۷)۔ دوسری حدیث میں حضرت عمرؓ کے عمل کا تذکرہ ہے، اور تیسری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل کا بیان ہے۔ چوتھی میں حضرت عمرؓ کے ایک اور عمل کا اظہار ہے۔ اور پانچویں میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس عام حکم کا بیان ہے، جسے انہوں نے اس سلسلے میں پوری اسلامی سلطنت میں بھیجا تھا۔ چنانچہ امام مالکؒ نے اس سلسلے میں رسول اکرمؐ، خلفاء راشدین، حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مسلسل عمل کو روایت کیا ہے، لیکن ان سب کے عمل سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں دیا ہے: ہمارے نزدیک قرآن مجید میں صرف گیارہ سجدے ہیں، اور مفصل سورتوں میں اس سلسلے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ امام مالکؒ نے جن گیارہ سجدوں کا ذکر کیا ہے، ان میں وہ سجدے جن کا اوپر ذکر ہوا اور جنہیں مذکورہ بالا شخصیات ادا کرتی رہیں، امام مالکؒ کے نزدیک ضروری نہیں ہیں۔ اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا صورت میں حضرت امام مالکؒ نے جو اختلاف مذکورہ بالا حضرات سے کیا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور کیا ان کا یہ اختلاف انکارِ حدیث کے مترادف ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سوالات جتنے اہم ہیں، اتنے ہی نازک بھی ہیں، اس لئے ان کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس معاملے میں فریقین کون ہیں۔ ظاہر ہے، ایک طرف آنحضرت صلعم، خلفاء راشدین، صحابہ کرام اور تابعین ہیں، اور دوسری طرف امام مالکؒ۔ دوسرا غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ امام مالکؒ نے جن شخصیتوں کے عمل سے اختلاف کیا، اسلام میں ان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ مسئلہ بھی اتنا واضح ہے کہ اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس اور خلفاء راشدین و صحابہ و تابعین کی حیثیت اسلام میں اتنی بڑی ہے کہ ان کے مقابلے میں کسی دوسرے کی نہیں۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ خود امام مالکؒ کی حیثیت کیا ہے؟ یہ بات بھی نہایت واضح ہے کہ امام مالکؒ اسلامی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کے اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔ جہاں تک امام مالکؒ سے پہلے واقعات و حالات کا تعلق ہے ان کے مطابق اُن کے اختلاف کی نوعیت ویسی ہی تھی، جیسے کہ ان کے پیش رووں کا آپس میں اختلاف تھا۔ جیسے آنحضرت صلعم کے بعض اعمال سے حضرت عمرؓ نے اختلاف کیا، اور صحابہ کرامؓ کے اعمال سے تابعین نے۔ جس طرح حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ، آنحضرت صلعم کی زندگی کے واقعات سے سنتِ رسولؐ کی تلاش کرتے اور اس کا نتیجہ اگرچہ رسول اللہؐ کے بعض اعمال سے مختلف ہوتا، لیکن ان مختلف اعمال کی روح ایک ہوتی۔ ان کی اصل ایک ہوتی، اور دونوں عمل دو مختلف ادوار کے حالات کے مطابق ایک ہی اصل کی دو مختلف شاخیں ہوتیں۔ اس لحاظ سے امام مالکؒ، رسول اکرمؐ، صحابہ کرامؓ اور تابعین کے سچے جانشین تھے۔ انھوں نے عہدِ رسالت، خلافتِ راشدہ اور عہدِ تابعین کے واقعات و حالات سے یہی نتیجہ نکالا اور وہ اس کے شدت سے قائل تھے۔ انھوں نے صحابہ و تابعین کی اصل اور سچی روایت کے مطابق ان احادیث و واقعات کے جوہر کو پہچاننے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اگرچہ احادیث و شخصیات سے بظاہر اختلاف کیا، لیکن معنوی اعتبار سے وہ ان احادیث و شخصیات کے مخلص متبع تھے۔ آج یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس ماحول اور اس دور کو دیکھا جائے تو یہ بات عام تھی۔ تابعین و تبع تابعین کا یہ طریقہ ماضی کی تاریخ کا ایک جزو لاینفک تھا۔ ہم نے اوپر دیکھا کہ امام مالک سے پہلے جن فقہاء عظام نے موطائیں ترتیب دیں انہوں نے احادیث کے بجائے احادیث کی روح اور ان کی اصل، سنتِ رسول کو اپنا موضوع بنایا۔ یہی حال مکی فقہاء کا تھا اور یہی طریقہ شامی، کوفی، بصری، مصری اور دوسرے علاقوں کے فقہاء کا تھا۔ اس لئے امام مالکؒ کے اختلاف کی نوعیت وہی تھی جو ان کے پیش رووں نے انہیں سکھلائی تھی۔ اور وہ اختلاف محض سطحی اور ظاہری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا۔ وہ اختلاف روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے تھا نہ کہ ان کے معنی اور مفہوم سے۔

اس تفصیل کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا امام مالک کے اختلاف کا مطلب ماضی کے واقعات و احادیث کا انکار تھا یا ان کا اقرار؟ تاریخ فقہ اسلامی کا ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوگا کہ امام مالک کے اس طرح واقعات و احادیث سے اختلاف کا مطلب ان سے انکار تھا۔ ان کی ترتیب دی ہوئی موطا جہاں فقہاء اور فقہ اسلامی کی بنیاد بنی، وہاں محدثین نے بھی اس کی نقل میں مجموعے تیار کئے۔ جب تک اسلام زندہ ہے۔ اور جب تک فقہ اسلامی تاریخ عالم کے اوراق میں ایک درخشندہ ستارے کی حیثیت سے چمکتی رہے گی، امام مالک کا نام روشن رہے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ امام مالک محض ایک محدث تھے، جو مسجد نبوی میں بیٹھ کر حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ یا ایک مؤرخ تھے جو گزرے ہوئے واقعات قلم بند کیا کرتے تھے۔ بلکہ امام مالک ماضی اور ماضی کے واقعات و حوادث سے اس لئے شغف رکھتے تھے تاکہ ان سے اس روح کی تلاش کریں جس کی وجہ سے وہ احادیث عمل میں آئیں۔ وہ اصول وضوابط معلوم کریں جن کے ذریعے خلفاء راشدین و تابعین نے سنت رسول کو سمجھا اور اپنے زمانے میں ان کی اتباع کی۔ ماضی کے واقعات و حوادث ان کے نزدیک سنتِ رسول کی اتباع کے مختلف پہلو تھے، اور وہ ان سے سنتِ رسول کے ان پہلوؤں کی تلاش کرتے، جو ان کے لئے اپنے زمانے کے حالات میں رہنما اصولوں کا کام دیتے۔ اوپر جو کچھ امام مالک کے بارے میں بیان ہوا، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ امام مالک کے ہاں سنت کا وہی تصوّر تھا جس کی تعلیم آنحضرت صلعم نے دی اور جس پر صحابہ کرام اور تابعین عظام نے عمل کیا، اور اس سے مراد وہ اصول اور قواعدِ کلیہ تھے، جن کے پیشِ نظر آنحضرت صلعم نے قرآنی تعلیمات کو عملاً نافذ فرمانے کی کوشش کی، اور جن کے پیشِ نظر صحابہ کرام نے عہدِ رسالت کے واقعات پر غور و فکر کر کے اپنے عہد کے پیش آمدہ حالات کا حل ڈھونڈھا، اور جو تابعین کے لئے رہنمائی کا کام دیتے رہے۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان ہُوا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صدرِ اسلام میں سنت سے مراد وہ بنیادی اور عالمگیر اصول تھے جنہیں آنحضرت صلعم قرآن کو عملاً نافذ کرتے وقت اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔ اور صحابہ کرام نے اتباعِ سنتِ رسول سے انہیں اصول و قواعد کی اتباع مراد لی تھی۔ اور یہی اصول و قواعد تابعین و تبع تابعین کے لئے رہنما اصولوں کا کام دیتے رہے، جنہیں اُنھوں نے ماضی کے واقعات و احادیث سے اخذ کیا تھا، اور ان کا اطلاق اپنے زمانے کے حالات پر کیا تھا، اگرچہ اس نظریئے کے ثبوت میں کافی شہادت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش کی جاچکی ہے، لیکن ذیل میں ہم تاریخ فقہ اسلامی کی ایک اور بہت بڑی شخصیت کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں، یہ شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کی ذاتِ گرامی ہے۔

شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور شرح موطا المصفی کے مقدمہ میں عبدالرحمٰن بن مہدی کا ایک قول نقل کیا ہے، جو یہ ہے: "سفیان الثوری حدیث کے امام ہیں، اور وہ سنت کے امام نہیں۔ اوزاعی سنت کے امام ہیں اور وہ حدیث کے امام نہیں۔ اور مالک بن انس دونوں کے امام ہیں"۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ حافظ ابن الصلاح سے عبدالرحمٰن بن مہدی کے اس بیان کی وضاحت پوچھی گئی تو انہوں نے بتایا: "یہاں سنت سے مراد بدعت کی ضد ہے، اور ایسا ممکن ہے کہ ایک شخص حدیث کا عالم ہو، اور وہ سنت کا عالم نہ ہو"۔ شاہ ولی اللہ، حافظ ابن الصلاح کی اس وضاحت سے مطمئن نظر نہیں آتے اور کہتے ہیں: میرے نزدیک یہ بیان مزید شرح کا محتاج ہے۔ اور پھر خود سنت کی تعریف کرتے ہیں: "یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ سلف معانی اور فتاوی کے استنباط میں دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ کا کام یہ تھا کہ وہ قرآن، حدیث اور آثارِ صحابہ کو جمع کرتے، اور ان سے استنباط کرتے، اور یہ طریقِ کار محدثین کے طرزِ عمل کی بنیاد تھا۔ اور دوسرے گروہ کے لوگوں کا کام یہ تھا کہ وہ قواعدِ کلیہ کو مدنظر رکھتے تھے، جن کی تنقیح و تھذیب آئمہ کی ایک جماعت نے کی تھی، اور اس ضمن میں وہ ان کے مآخذ پہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ اور جب کبھی انہیں کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ اس کا جواب ان قواعدِ کلیہ کی مدد سے دیتے، اور یہ طریقہ فقہاء کے طرزِ عمل کی بنیاد تھا۔ اول الذکر طریقہ سلف کے ایک حصے پر غالب تھا اور مؤخر الذکر طریقہ سلف کے دوسرے حصے پر۔ جیسے کہ ایک جماعت کا قول ہے کہ حماد بن ابی سلیمان ابراہیم نخعی کے مسائل کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، یعنی اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ان قواعدِ کلیہ کو جاننے والے ہیں جنہیں ابراہیم نے اپنے فتاوے میں تنقیح معینہ شکل میں بیان کیا ہے۔ امام مالک جب اپنی کتاب موطا میں سنت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ اہلِ مدینہ کے نزدیک متعینہ قواعد ہی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔ سنت جس پر ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں، یہ اور یہ ہے"۔ (المسوی ص ۱۵، ۱۶)

اس عبارت میں شاہ ولی اللہ نے بڑے واضح الفاظ میں صدرِ اسلام کے تصورِ سنت کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ صدرِ اسلام کے فقہاء نے چند قواعدِ کلیہ متعین کر رکھے تھے، اور استنباطِ مسائل میں وہ قواعدِ کلیہ [illegible] اصولوں کا کام دیتے تھے۔ وہ انہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی مدد سے پیش آمدہ مسائل کا حل ڈھونڈھتے اور استنباطِ مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے۔ ظاہر ہے قرونِ اولیٰ کے ان فقہاء کے یہ قواعدِ کلیہ ایسے ہی من گھڑت نہ تھے، بلکہ یہ قواعدِ کلیہ ان کی اسلام فہمی کا نچوڑ تھے۔ قرآن و حدیث اور گذشتہ حالات و واقعات پر گہرے غور و خوض اور انتہائی سوچ بچار کے بعد وہ ایسے اُصول نکال پاتے تھے، اور ان کی مدد سے وہ آئندہ استنباطِ مسائل میں رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ یہ قواعدِ کلیہ دراصل ان کے نزدیک ان اصول و نظریات پر مبنی تھے، جنہیں رسولِ اکرمؐ پیشِ نظر رکھ کر اپنے پیشِ آمدہ معاملات کو حل کرتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صدرِ اسلام کے فقہاء کے قواعدِ کلیہ درحقیقت آنحضرت صلعم کے اصول و قواعد کا پَرتو ہوتے تھے۔ اور یہ قواعدِ کلیہ دراصل سنتِ رسول کے قائم مقام ہوتے تھے۔ فقہاءِ عظام اس بات کو پیشِ نظر رکھتے تھے کہ ان کے زمانے میں اگر رسولِ اکرم صلعم خود موجود ہوتے تو وہ ان مسائل کو کن قواعدِ کلیہ اور اصول و نظریات کے مطابق حل کرتے۔ اور پھر عہدِ رسالت کے واقعات اور عہدِ صحابہ کے حالات پر غور کرنے کے بعد ان قواعدِ کلیہ کی صورت میں اس کا جواب پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے فقہاء اپنے ان قواعدِ کلیہ کا نام سنت رکھتے تھے۔ اور سنت سے ان کی مراد وہ مثالی عمل ہوتا تھا جس کی تعلیم رسولِ اکرمؐ نے دی تھی، اور جس پر صحابہ کرامؓ نے اپنے زمانے میں عمل کیا تھا۔ عراقی فقہاء اسے "السنۃ المحفوظۃ المعروفۃ" کہتے تھے۔ شامی فقہاء اس کا نام "سنۃ المسلمین" رکھتے تھے۔ اور مدنی فقہاء اسے "السنۃ عندنا" کے نام سے پکارتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام مالک موطا میں جب ان متعینہ قواعد کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں: السنۃ التی لا اختلاف فیھا عندنا: وہ سنت جس پر ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں۔

ہم اوپر تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں کہ اسلام کے اس ابتدائی دَور میں سنت اور حدیث میں بڑا فرق تھا۔ حدیث، سنت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک خاص پہلو کا بیان سمجھی جاتی تھی، اور سنت کا وہ پہلو اس لئے انتہائی اہم تھا کہ اس پر غور کر کے دوسرے پہلوؤں کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن حدیث بنفسہٖ سنت کے تمام پہلوؤں کے مترادف نہ تھی۔ اسی طرح یہ بات بھی انتہائی قابلِ ذکر ہے کہ حدیث کے بغیر سنت کا پتہ لگانا محال ہے، اور جب تک عہدِ رسالتؐ، عہدِ صحابہؓ اور بعد کے تاریخی واقعات کا گہرا علم حاصل نہ ہو، سنتِ رسولؐ کی کھوج لگانا ناممکن ہے، لہٰذا حدیث و سنت لازم و ملزوم ہیں اور حدیث کے بغیر سنت کا تعین نہیں ہو سکتا۔

© rasailojaraid.com